ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY

Name:

Registration No.:

Course Code: 2970

Program: BS (Islamic Studies)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

(شعبہ شریعہ، کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ)

کورس: اسلامی ریاست و نظام حکومت کے بنیادی اصول و تصورات (2970) • سطح: بی ایس (علوم اسلامیہ)

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 1 (بوٹ: 1 تا 4)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 50

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں۔ جہاں کسی دینی یا قانونی مسئلے میں قطعی رائے درکار ہو وہاں اہلِ علم اور مستند علماء کی طرف رجوع کریں۔

سوال نمبر 1: اسلامی ریاست میں نظم، اطاعتِ اولی الامر اور شوریٰ کی اہمیت

سوال نمبر 1۔ اسلامی ریاست میں نظم، اطاعتِ اولی الامر اور شوریٰ کی کیا اہمیت ہے؟ قرآن و سنت کی روشنی میں وضاحت کریں کہ شوریٰ ریاستی نظام میں کیسے بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ (20)

تعارف

اسلامی ریاست کا نظام چند باہم مربوط اصولوں پر قائم ہے جن میں نظم وضبط، اطاعتِ اولی الامر اور شوریٰ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ کوئی بھی ریاست خواہ کتنی ہی وسیع اور طاقتور کیوں نہ ہو، اگر اس میں نظم نہ ہو تو وہ انتشار کا شکار ہو جاتی ہے، اگر حکمران کی جائز اطاعت کا تصور نہ ہو تو قانون کی عملداری ختم ہو جاتی ہے، اور اگر فیصلہ سازی میں مشورے کا عمل نہ ہو تو حکمرانی شخصی خواہشات کا نام بن جاتی ہے۔ اسلام نے ان تینوں عناصر کو اس خوبصورتی سے جوڑا ہے کہ حکمران مشورے کا پابند ہے، عوام جائز امور میں اطاعت کے پابند ہیں، اور پورا نظام اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے تابع چلتا ہے۔ اس سوال کے جواب میں پہلے نظم اور اطاعتِ اولی الامر کی اہمیت بیان کی جائے گی، پھر قرآن وسنت کی روشنی میں شوریٰ کے مفہوم اور اس کے بنیادی کردار کی وضاحت کی جائے گی۔ یاد رہے کہ یہ بحث خالصتاً علمی اور علمی ہے؛ کسی عملی مسئلے میں قطعی شرعی رائے کے لیے اہلِ علم کی طرف رجوع ہی درست طریقہ ہے۔

اسلامی ریاست میں نظم کی اہمیت

نظم سے مراد وہ باقاعدہ ترتیب اور ضبط ہے جس کے تحت ریاست کے تمام ادارے اور افراد اپنے اپنے دائرے میں فرائض انجام دیتے ہیں۔ اسلام ایک منظم دین ہے؛ نماز کی جماعت، روزے کے اوقات، زکوٰۃ کے نصاب اور حج کے مناسک سب نظم کی تربیت دیتے ہیں۔ یہی تربیت ریاستی زندگی میں بھی مطلوب ہے۔ اگر ریاست میں نظم نہ ہو تو اختیارات ٹکراتے ہیں، فرائض میں غفلت پیدا ہوتی ہے، قانون کمزور پڑ جاتا ہے اور شہریوں کے حقوق محفوظ نہیں رہتے۔ اسلامی ریاست میں نظم کا مطلب یہ ہے کہ ہر عہدہ، ہر ادارہ اور ہر فرد کی ذمہ داری متعین ہو، فیصلے باقاعدہ طریقے سے ہوں، اور احتساب کا عمل موجود ہو۔ نبی کریم ﷺ نے مدینہ منورہ میں ریاست قائم کرتے ہی انتظامی نظم کی بنیاد رکھی: کاتبین مقرر کیے، عاملین بھیجے، بیت المال کا بندوبست کیا اور مختلف قبائل کے ساتھ تعلقات کو لکھے ہوئے معاہدوں کی شکل دی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظم اسلامی ریاست کی روح ہے اور اس کے بغیر عدل، امن اور فلاح کے مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے۔

اطاعتِ اولی الامر کا مفہوم اور اس کی اہمیت

اولی الامر سے مراد وہ اصحابِ اختیار ہیں جن کے سپرد ریاست کے معاملات کی نگرانی اور فیصلہ سازی ہو، خواہ وہ سربراہِ ریاست ہو یا اس کے مقرر کردہ ذمہ داران۔ قرآن مجید کی سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو اللہ کی اطاعت، رسول کی اطاعت اور اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا ہے، اور تنازعے کی صورت میں معاملہ اللہ اور رسول کی طرف لوٹانے کی ہدایت فرمائی ہے۔ اس آیت سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں: ایک یہ کہ حکمران کی اطاعت دینی اور آئینی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس کے بغیر نظم قائم نہیں رہ سکتا؛ دوسری یہ کہ یہ اطاعت مطلق نہیں بلکہ شریعت کے تابع ہے۔ سیرت اور احادیث کے امور کا مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جائز اور نیکی کے امور میں حکمران کی بات ماننا ضروری ہے، لیکن اللہ کی نافرمانی پر مبنی حکم کی اطاعت جائز نہیں۔ اس متوازن اصول کا فائدہ یہ ہے کہ ایک طرف انتشار اور بغاوت کا دروازہ بند ہوتا ہے اور دوسری طرف حکمران کو بھی یہ احساس رہتا ہے کہ اس کا اختیار شریعت کی حدود کے اندر ہے۔ اطاعتِ اولی الامر دراصل شہری اور ریاست کے درمیان اعتماد کا رشتہ ہے؛ جب شہری قانون کی پابندی کرتے ہیں تو ریاست امن و انصاف فراہم کرنے کے قابل ہوتی ہے، اور جب حکمران عدل کرتا ہے تو اطاعت خود بخود دلوں میں جگہ بناتی ہے۔

شوریٰ کا مفہوم اور قرآن کی روشنی میں اس کی اہمیت

شوریٰ کے لغوی معنی مشورہ کرنے اور باہم رائے لینے کے ہیں۔ اصطلاح میں شوریٰ سے مراد یہ ہے کہ اجتماعی معاملات کا فیصلہ اہلِ رائے اور متعلقہ افراد سے مشورہ کر کے کیا جائے۔ قرآن مجید کی سورۃ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو معاملات میں صحابہ سے مشورہ کرنے کی ہدایت فرمائی اور فیصلہ ہو جانے کے بعد اللہ پر توکل کا حکم دیا۔ اسی طرح سورۃ الشوریٰ میں اہلِ ایمان کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ ان کا معاملہ باہمی مشورے سے طے ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس سورت کا نام ہی شوریٰ رکھا گیا، جو اس اصول کی غیر معمولی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ غور کیجیے کہ نبی کریم ﷺ وحی کے ذریعے براہ راست رہنمائی پاتے تھے، اس کے باوجود آپ کو مشورے کا حکم دیا گیا۔ اس سے امت کے لیے سبق ہے کہ جب معصوم ہستی کو بھی مشورے کی تعلیم دی گئی تو عام حکمرانوں کے لیے مشورے سے گریز کی کوئی گنجائش نہیں۔ قرآن کی یہ تعلیم شوریٰ کو محض انتظامی سہولت نہیں بلکہ ایمانی صفت اور ریاستی اصول قرار دیتی ہے۔

سنت اور سیرت میں شوریٰ کے عملی نمونے

نبی کریم ﷺ کی سیرت شوریٰ کی عملی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ غزوۂ بدر کے موقع پر آپ ﷺ نے لشکر کی پڑاؤ گاہ کے بارے میں صحابہ سے مشورہ کیا اور ایک صحابی کی بہتر رائے قبول فرمائی۔ غزوۂ احد میں مدینہ کے اندر رہ کر مقابلہ کرنے یا باہر نکلنے کا فیصلہ اکثریت کے مشورے کے مطابق ہوا، اگرچہ ذاتی رائے اس سے مختلف تھی، اور آپ ﷺ نے مشورے کے فیصلے کی پابندی فرمائی۔ غزوۂ خندق میں مدینہ کے گرد خندق کھودنے کی تجویز مشورے سے منظور ہوئی، اور صلح حدیبیہ کے موقع پر بھی آپ ﷺ نے مشورے پر عمل فرما کر امت کو سکھایا کہ قیادت مشورے کو عزت دیتی ہے۔ خلفائے راشدین کے دور میں یہ سلسلہ باقاعدہ نظام کی صورت اختیار کر گیا؛ اہم فیصلے مجلسِ شوریٰ میں طے ہوتے، ماہرین اور قبائل کے نمائندوں سے رائے لی جاتی اور فیصلے کے اسباب عوام کے سامنے رکھے جاتے۔ ان نمونوں سے ثابت ہوتا ہے کہ شوریٰ اسلامی ریاست میں کوئی رسمی کارروائی نہیں بلکہ فیصلہ سازی کا باقاعدہ اور محترم طریقہ ہے۔

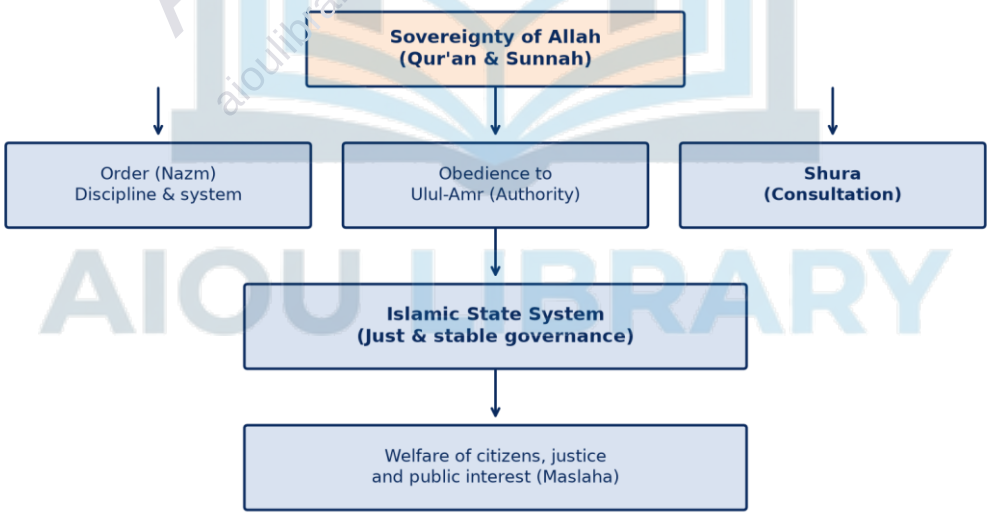

شکل 1: اسلامی ریاستی نظام کی بنیاد — حاکمیتِ الٰہی کے تحت نظم، اطاعتِ اولی الامر اور شوریٰ کا باہمی تعلق (انگریزی خاکہ)۔

شورٰی کا ریاستی نظام میں بنیادی کردار

شورٰی کا پہلا بنیادی کردار یہ ہے کہ یہ استبداد کی روک تھام کرتی ہے۔ جب فیصلے مشورے سے ہوتے ہیں تو کوئی فرد یا گروہ ریاست کو ذاتی جاگیر نہیں بنا سکتا، کیونکہ ہر فیصلے کے پیچھے اجتماعی غور موجود ہوتا ہے۔ دوسرا کردار فیصلوں کے معیار کی بہتری ہے؛ مختلف تجربات اور آراء سامنے آنے سے غلطی کا امکان کم ہو جاتا ہے اور عوامی مفاد کے قریب ترین فیصلہ سامنے آتا ہے۔ تیسرا کردار عوامی اعتماد اور شرکت ہے، جن لوگوں سے مشورہ لیا جاتا ہے یا جن کے نمائندے فیصلے میں شامل ہوتے ہیں، وہ فیصلے کو اپنا سمجھ کر اس پر عمل بھی کرتے ہیں، جس سے اطاعتِ قانون مضبوط ہوتی ہے۔ چوتھا کردار قیادت کی تربیت ہے؛ شورٰی کے ذریعے نئی قیادت تیار ہوتی ہے اور معاملات کی سمجھ بوجھ نسل در نسل منتقل ہوتی ہے۔ پانچواں کردار اختلاف کو پرامن طریقے سے حل کرنا ہے؛ شورٰی میں اختلاف رائے دشمنی نہیں بنتی بلکہ بہتر حل تک پہنچنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ چھٹا کردار احتساب کی فضا قائم کرنا ہے؛ جہاں مشورہ عام ہو وہاں حکمران خود کو جواب دہ سمجھتا ہے۔ ان وجوہ سے مفکرین نے شورٰی کو اسلامی نظامِ حکومت کی بنیاد اور روح قرار دیا ہے۔

جدول 1: نظم، اطاعت اور شورٰی کا باہمی تعلق

ریاست میں کردار	مفہوم	عنصر
انتظام میں تسلسل، قانون کی عملداری اور حقوق کا تحفظ	اداروں اور فرائض کی باقاعدہ ترتیب و ضبط	نظم
نظم کی حفاظت، انتشار کی روک، شریعت کی حدود کی پابندی	جائز و معروف امور میں اصحابِ اختیار کی پابندی	اطاعتِ اولی الامر
استبداد کی روک، بہتر فیصلے، عوامی اعتماد اور احتساب	اجتماعی معاملات میں اہلِ رائے سے مشورہ	شورٰی

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست میں نظم، اطاعتِ اولی الامر اور شوریٰ تین الگ الگ باتیں نہیں بلکہ ایک ہی نظام کے باہم جڑے ہوئے حصے ہیں۔ نظم ریاست کو ترتیب دیتا ہے، اطاعت اس ترتیب کو قائم رکھتی ہے، اور شوریٰ اس نظام کو انصاف، حکمت اور عوامی مفاد کی راہ پر چلاتی ہے۔ قرآن نے شوریٰ کو ایمانی صفت قرار دیا اور سنت نے اس کی عملی مثالیں قائم کیں، اس لیے شوریٰ اسلامی ریاستی نظام میں بنیادی کردار کی حامل ہے۔ ساتھ یہ اصول بھی واضح رہے کہ اطاعت شریعت کے تابع ہے اور مشورہ بھی اسی دائرے میں رہ کر کیا جاتا ہے۔ جس ریاست میں یہ توازن قائم ہو وہ استحکام، عدل اور عوامی اعتماد حاصل کرتی ہے، اور یہی اسلامی تعلیمات کا مقصود ہے۔

سوال نمبر 2: سیاسی، دفاعی، معاشی، معاشرتی اور خارجہ نظام کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر

سوال نمبر 2۔ سیاسی، دفاعی، معاشی، معاشرتی اور خارجہ پالیسی کے نظام کے حوالے سے اسلامی نقطۂ نظر واضح کریں۔ (20)

تعارف

اسلام محض عبادات کا مجموعہ نہیں بلکہ مکمل ضابطۂ حیات ہے جو فرد اور معاشرے کی اجتماعی زندگی کے لیے بھی اصول فراہم کرتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر کی بنیاد چند جامع اصولوں پر ہے: حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے اور انسان زمین پر اس کا خلیفہ ہے؛ قانون کی بنیاد عدل ہے؛ ہر نظام کا مقصد انسان کی دنیوی و اخروی فلاح ہے؛ اور تمام شعبے شریعت کے مقاصد یعنی دین، جان، عقل، نسل اور مال کے تحفظ کے تابع ہیں۔ اسی لیے اسلامی ریاست کا سیاسی، دفاعی، معاشی، معاشرتی اور خارجہ نظام الگ الگ جزیرے نہیں بلکہ ایک ہی مقصد کے مختلف پہلو ہیں۔ ذیل میں ہر شعبے کا اسلامی نقطۂ نظر الگ الگ بیان کیا جاتا ہے اور آخر میں ان کے باہمی ربط کی وضاحت کی جاتی ہے۔

سیاسی نظام کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر

سیاسی نظام میں اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اقتدار امانت ہے، ذاتی ملکیت نہیں۔ حکمران اللہ کے سامنے بھی جواب دہ ہے اور عوام کے سامنے بھی۔ سربراہِ ریاست اور دیگر ذمہ داران کا تقرر اہلیت، دیانت اور مشورے کی بنیاد پر ہوتا ہے، نسل، خاندان یا دولت کی بنیاد پر نہیں۔ فیصلے شوریٰ سے ہوتے ہیں، قانون سب کے لیے یکساں ہے اور حکمران خود بھی قانون سے بالاتر نہیں۔ سیاسی نظام کے مقاصد عدل کا قیام، مظالم کا خاتمہ، نیکی کا فروغ اور برائی کی روک تھام ہیں۔ اسلام شخصی آمریت اور مطلق العنانی کی نفی کرتا ہے، مگر ساتھ ہی انتشار اور بغاوت کی بھی حوصلہ شکنی کرتا ہے؛ توازن یہ ہے کہ حکمران مشورے، اور قانون کا پابند ہو اور شہری جائز امور میں نظام کے ساتھ تعاون کریں۔ اس سیاسی تصور میں مخالف رائے کو احترام سے سنا جاتا ہے، بشرطیکہ وہ فتنہ و فساد کی صورت اختیار نہ کرے۔

دفاعی نظام کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر

دفاعی نظام کا مقصد اسلام کی نظر میں جارحیت نہیں بلکہ ریاست، شہریوں اور مظلوموں کا تحفظ ہے۔ دفاع کی تیاری اس لیے ضروری قرار دی گئی کہ طاقت کا توازن قائم رہے اور دشمن جارحیت کی جرات نہ کرے۔ قرآن مجید کی عمومی تعلیم یہ ہے کہ جنگ کی اجازت دفاع اور ظلم کے خاتمے کے لیے ہے، اور حد سے تجاوز کی ممانعت ہے؛ جو فریق صلح کی طرف مائل ہو اس کے ساتھ صلح کو ترجیح دی جاتی ہے۔ دفاعی نظام میں شہری آبادی، بچوں، بوڑھوں اور عبادت گاہوں کے تحفظ اور معاہدوں کی پابندی جیسے اخلاقی اصول بھی شامل ہیں، جن کی عملی مثالیں سیرت میں ملتی ہیں۔ جدید دور میں اس اصول کا اطلاق منظم سکیورٹی اداروں، سرحدوں کے تحفظ اور بین الاقوامی قوانین کی پابندی کی صورت میں ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اسلامی دفاعی نقطۂ نظر طاقت کو مقصد نہیں، امن کے تحفظ کا ذریعہ سمجھتا ہے۔

معاشی نظام کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر

معاشی نظام میں اسلام کا نقطۂ نظر توازن اور عدل پر مبنی ہے۔ اسلام نجی ملکیت اور حلال کمائی کی آزادی کو تسلیم کرتا ہے، تجارت کو پسند کرتا ہے اور محنت کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، مگر ساتھ ہی سود، ذخیرہ اندوزی، ناپ تول میں کمی، دھوکا دہی اور استحصال کی ممانعت کرتا ہے۔ زکوٰۃ، صدقات اور انفاق کے ذریعے دولت کی گردش کو یقینی بنایا جاتا ہے

تا کہ مال چند ہاتھوں میں سمٹ کر نہ رہ جائے۔ بیت المال اجتماعی ضرورتوں، فقراء، یتیموں اور عوامی سہولتوں پر خرچ ہوتا ہے۔ اسلامی معاشی تصور سرمایہ دارانہ استحصال اور اشتراکی جبر دونوں کے درمیان درمیانی راہ ہے: فرد کو کمائی اور ملکیت کا حق ہے، مگر اس کے مال میں معاشرے کا حق بھی ہے۔ اسی توازن سے معاشی استحکام، سماجی ہمدردی اور کاروباری اعتماد پیدا ہوتا ہے۔

معاشرتی نظام کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر

معاشرتی نظام کی بنیاد اسلام نے عدل، مساوات اور اخوت پر رکھی ہے۔ تمام انسان عزت و احترام میں برابر ہیں اور فضیلت کا معیار تقویٰ ہے، نہ کہ نسل، رنگ یا زبان۔ خاندان معاشرے کی بنیادی اکائی ہے؛ والدین، اولاد، رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے حقوق متعین کیے گئے ہیں۔ تعلیم حاصل کرنا ہر مسلمان کے لیے پسندیدہ اور ضروری قرار دیا گیا، غیر مسلم شہریوں کے جان و مال اور عبادت کا تحفظ ریاست کی ذمہ داری ہے، اور کمزور طبقات، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کی کفالت اجتماعی فریضہ ہے۔ معاشرتی نظام میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اصول معاشرے کو اخلاقی بگاڑ سے بچاتا ہے، لیکن اس کا اطلاق بھی قانون اور حکمت کے دائرے میں ہوتا ہے۔ اس طرح اسلامی معاشرہ طبقاتی نفرت کے بجائے تعاون اور ذمہ داری پر قائم ہوتا ہے۔

خارجہ پالیسی کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر

خارجہ پالیسی کا اسلامی نقطۂ نظر امن، عدل اور وفائے عہد پر مبنی ہے۔ اسلامی ریاست دیگر ریاستوں کے ساتھ تعلقات میں معاہدوں کی پابندی، سفارتی آداب کا احترام اور غیر جارحانہ رویے کو اصل اصول مانتی ہے۔ مسلم ریاستوں کے ساتھ تعلقات اخوت اور تعاون پر مبنی ہوتے ہیں، جبکہ غیر مسلم ریاستوں کے ساتھ بھی انصاف اور بھلائی کی تعلیم ہے بشرطیکہ وہ محارب نہ ہوں۔ دعوت و تبلیغ کا طریقہ حکمت اور اچھے انداز سے ہے، جبر سے نہیں۔ بین الاقوامی تنازعات میں ثالثی، مذاکرات اور صلح کو جنگ پر ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ نقطۂ نظر آج کے بین الاقوامی قانون کے بنیادی اصولوں، یعنی ریاستی خود مختاری کا احترام، معاہدوں کی پابندی اور پرامن بقائے باہمی، سے گہری مناسبت رکھتا ہے، جس کی تفصیل اسائنمنٹ کے پانچویں سوال میں بھی آئے گی۔

جدول 1: پانچوں شعبوں میں اسلامی نقطۂ نظر کا خلاصہ

شعبہ	بنیادی اصول	مرکزی مقصد
سیاسی	امانت، شوریٰ، اہلیت، قانون کی یکسانیت	عدل کا قیام اور عوامی فلاح
دفاعی	تحفظ، تیاری، حد سے عدم تجاوز، صلح کو ترجیح	امن و سلامتی کا تحفظ
معاشی	حلال کمائی، سود کی ممانعت، زکوٰۃ سے گردشِ دولت	معاشی عدل اور استحکام
معاشرتی	مساوات، اخوت، حقوق کی ادائیگی	پرسکون اور باہمی تعاون والا معاشرہ
خارجہ	وفائے عہد، عدم جارحیت، مذاکرات	پرامن بین الاقوامی تعلقات

باہمی ربط اور خلاصہ

ان پانچوں شعبوں کا باہمی ربط سمجھنا ضروری ہے۔ سیاسی نظام عادل ہو تو معاشی اور معاشرتی نظام درست چلتے ہیں؛ معیشت مستحکم ہو تو دفاع مضبوط ہوتا ہے؛ معاشرہ متحد ہو تو خارجہ پالیسی موثر ہوتی ہے؛ اور پرامن خارجہ تعلقات اندرونی ترقی کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ اسلام نے یہ ربط اس لیے قائم کیا کہ ریاست ایک جسم کی مانند ہے جس کے تمام اعضاء ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر ہر شعبے میں عدل، توازن اور انسانی فلاح کو مرکز بناتا ہے؛ نہ طاقت کو بے لگام چھوڑتا ہے اور نہ کمزور کو بے سہارا۔ یہی جامعیت اسلامی ریاستی نظام کی نمایاں خصوصیت ہے اور یہی اس باب کا اصل سبق ہے۔

سوال نمبر 3: ہجرتِ مدینہ — اسلامی ریاست کی تشکیل کا فیصلہ کن مرحلہ اور ابتدائی سماجی اقدامات

سوال نمبر 3۔ ہجرتِ مدینہ کو اسلامی ریاست کی تشکیل میں فیصلہ کن مرحلہ کیوں قرار دیا جاتا ہے؟ ہجرت کے بعد رسول اللہ ﷺ کے ابتدائی سماجی اقدامات بیان کریں۔

(20)

تعارف

اسلامی تاریخ میں ہجرتِ مدینہ وہ عظیم موڑ ہے جہاں دعوت ایک ایسی منظم ریاست میں بدلی جس کے پاس اپنا علاقہ، اپنا نظام اور اپنے شہری تھے۔ مکہ مکرمہ میں تیرہ برس تک دعوت و تبلیغ جاری رہی، عقیدہ پختہ ہوا اور افراد کی تربیت ہوئی، لیکن وہاں آزاد ریاستی نظام قائم کرنے کا رضا میسر نہ تھی؛ مسلمان مظلوم تھے اور اجتماعیت کو تحفظ حاصل نہ تھا۔ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ کو مرکز بنا کر پہلی اسلامی ریاست کی عملی بنیاد رکھی گئی۔ اسی لیے محققین ہجرت کو اسلامی ریاست کی تشکیل میں فیصلہ کن مرحلہ قرار دیتے ہیں۔ اس جواب میں پہلے اس فیصلہ کن حیثیت کی وجوہات بیان کی جائیں گی، پھر ہجرت کے بعد رسول اللہ ﷺ کے ابتدائی سماجی اقدامات کی تفصیل پیش کی جائے گی۔

ہجرت فیصلہ کن مرحلہ کیوں قرار دی جاتی ہے؟

پہلی وجہ یہ ہے کہ ہجرت نے مسلمانوں کو ظلم و اقلیت کی فضا سے نکال کر آزاد فضا فراہم کی جہاں وہ اپنے دین پر عمل بھی کر سکے اور اجتماعی نظام بھی بنا سکے۔ دوسری وجہ یہ کہ مدینہ کے قبائل، خصوصاً اوس و خزرج، نے بیعتِ عقبہ کے ذریعے پہلے سے دعوت قبول کر لی تھی، یوں ریاست کو مقامی آبادی کی رضامندی اور حمایت حاصل تھی، جو کسی بھی ریاست کے استحکام کی بنیاد ہوتی ہے۔ تیسری وجہ یہ کہ مدینہ زرعی اور تجارتی اعتبار سے خود کفیل علاقہ تھا اور مکہ و شام کے تجارتی راستے پر واقع ہونے کی وجہ سے اس کی تزویراتی اہمیت بھی تھی۔ چوتھی وجہ یہ کہ ہجرت کے ساتھ ہی مسلمانوں کی تاریخ کا مستقل آغاز ہوا؛ اسلامی تقویم کا آغاز بھی اسی واقعے سے رکھا گیا، جو اس بات کی علامت ہے کہ امت کی اجتماعی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔ پانچویں وجہ یہ کہ مکہ کی انفرادی تربیت کے بعد مدینہ میں ادارہ سازی کا مرحلہ آیا: مسجد، مواخات، تحریری معاہدہ، عدالتی و انتظامی بندوبست اور دفاعی تیاری، یہ سب ریاستی عناصر ہجرت کے بعد ہی وجود میں آئے۔ چھٹی وجہ نفسیاتی اور اخلاقی ہے؛ ہجرت نے ثابت کیا کہ مومنین مقصد کے لیے گھر بار اور

وطن قربان کر سکتے ہیں، اور یہی قربانی ریاست کی خدمت گزار قیادت اور وفادار شہری پیدا کرتی ہے۔ ان تمام وجوہ کے مجموعے نے ہجرت کو محض نقل مکانی نہیں بلکہ ریاست کی بنیاد بنا دیا۔

ابتدائی سماجی اقدام نمبر 1: مسجدِ نبوی کی تعمیر

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ پہنچتے ہی سب سے پہلے مسجدِ نبوی کی بنیاد رکھی۔ ظاہر میں یہ عبادت گاہ تھی مگر عملاً یہ ریاست کا مرکز تھی؛ یہاں نماز بھی ہوتی، تعلیم بھی، مشورے بھی، وفود کی ملاقات بھی اور سماجی مسائل کا حل بھی۔ قبا میں قیام کے دوران مسجدِ قبا اور پھر مدینہ میں مسجدِ نبوی کی تعمیر اس بات کا اعلان تھا کہ نئی ریاست کی مرکزیت کسی قلعے یا دربار کو نہیں بلکہ اس ادارے کو حاصل ہے جو عبادت، علم اور اجتماعیت کو جوڑتا ہے۔ مسجد سے وابستہ صفہ کا چبوترہ بے گھر اور محتاج طلبہ و مسافروں کی رہائش و تعلیم کا انتظام تھا، جس سے سماجی فلاح کا پہلا عملی نظام قائم ہوا۔

ابتدائی سماجی اقدام نمبر 2: مواخات — مہاجرین و انصار کی بھائی چارگی

دوسرا بڑا سماجی اقدام مواخات تھی، جس کے تحت مہاجرین کو انصار کے ساتھ بھائی بھائی بنا دیا گیا۔ مہاجرین گھر بار اور مال چھوڑ کر آئے تھے؛ یہ بے سر و سامانی ریاست کے لیے معاشی اور سماجی بحران بن سکتی تھی۔ مواخات نے اس مسئلے کو ادارہ جاتی انداز سے حل کیا: انصار نے رہائش، روزگار اور کاروبار میں شراکت پیش کی اور بعض نے اپنے مال کا حصہ پیش کرنے تک کی پیشکش کی۔ اس اقدام سے نہ صرف مہاجرین کی آبادکاری ہوئی بلکہ قبائلی عصبیت کی جگہ ایمانی اخوت نے لے لی اور مدینہ کی آبادی ایک امت کی صورت میں ڈھلنے لگی۔ تاریخ میں آبادکاری کا یہ منفرد تجربہ آج بھی سماجی پالیسی کے لیے نمونہ ہے کہ بحران کو خیرات کے بجائے شراکت اور وقار کے ساتھ حل کیا جائے۔

ابتدائی سماجی اقدام نمبر 3: میثاقِ مدینہ — تحریری سماجی و آئینی معاہدہ

تیسرا اور نہایت اہم اقدام میثاقِ مدینہ تھا، جسے دنیا کے ابتدائی تحریری معاہدوں اور دستوروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس معاہدے میں مدینہ کے تمام گروہوں، مسلمان قبائل اور یہودی قبائل، کے حقوق و فرائض تحریری صورت میں متعین کیے گئے۔ اس کی نمایاں خصوصیات یہ تھیں: تمام فریق ایک سیاسی وحدت کے طور پر مدینہ کے دفاع کے ذمہ دار

ہوں گے؛ ہر گروہ کو اپنے مذہب پر عمل کی آزادی ہو گی؛ کسی فریق کو انفرادی طور پر دشمن سے صلح یا معاہدے کا حق نہیں ہو گا؛ تنازعات کا فیصلہ رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کر کے ہو گا؛ اور خون بہا اور فدیے جیسے پرانے قبائلی معاملات کو باہمی تعاون سے چلایا جائے گا۔ اس میثاق نے کثیر الجماعتی شہر کو ایک منظم ریاست میں بدلا اور شہریت، قانون کی بالادستی اور اقلیتوں کے تحفظ کی ابتدائی عملی صورت پیش کی۔

دیگر ابتدائی اقدامات: تعلیم، بازار، اذان اور باہمی نظم

ان تین بڑے اقدامات کے علاوہ کئی اور سماجی و انتظامی اقدامات بھی اسی ابتدائی دور میں ہوئے۔ اذان کی مشروعیت سے اجتماعی وقت اور جماعت کا نظم قائم ہوا اور مسلمانوں کی مستقل شناخت بنی۔ تعلیم کو سرکاری اہتمام حاصل ہوا؛ مسجد تعلیم کا مرکز بنی اور بعد میں لکھنے پڑھنے کی تعلیم کو فروغ ملا۔ معاشی میدان میں مسلمانوں کے لیے الگ بازار قائم کیا گیا تاکہ کاروبار سود اور اجارہ داری سے پاک ماحول میں چل سکے۔ مختلف قبائل اور بیرونی طاقتوں کے ساتھ خطوط معاہدوں کا سلسلہ شروع ہوا، جس سے ریاست کے خارجہ تعلقات منظم ہوئے۔ رشتہ داروں، پڑوسیوں اور مساکین کے حقوق کی تاکید سے سماجی ذمہ داری کی فضا بنی۔ یہ تمام اقدامات اگرچہ بظاہر سادہ تھے، مگر ان کے مجموعی اثر نے مدینہ کو چند ماہ میں ایک منتشر آبادی سے منظم ریاست میں تبدیل کر دیا۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ ہجرتِ مدینہ فیصلہ کن مرحلہ اس لیے ہے کہ اس نے دعوت کو ریاست، افراد کو شہری اور نظریے کو نظام میں بدل دیا۔ رسول اللہ ﷺ کے ابتدائی سماجی اقدامات، مسجدِ نبوی کی تعمیر، مواخات اور میثاقِ مدینہ، اس بات کی روشن دلیل ہیں کہ اسلامی ریاست کی بنیاد طاقت سے پہلے سماجی تنظیم، اخلاقی تربیت اور قانون پر رکھی گئی۔ یہی ترتیب بعد کے تمام اسلامی ریاستی تجربات کے لیے بنیادی نمونہ بنی اور آج بھی اس اصول کی تعلیم دیتی ہے کہ پائیدار ریاست پہلے معاشرہ بناتی ہے، پھر ادارے اسی معاشرے کی حفاظت کرتے ہیں۔

سوال نمبر 4: علمِ سیاست کی ابتدا اور افلاطون، ارسطو اور مسلم علماء کے سیاسی افکار کا تقابلی جائزہ

سوال نمبر 4۔ علمِ سیاست کی ابتدا پر روشنی ڈالیں۔ افلاطون، ارسطو اور مسلم علماء کے سیاسی افکار کا تقابلی جائزہ پیش کریں۔ (20)

تعارف

علمِ سیاست وہ علم ہے جو ریاست کی ماہیت، حکومت کی اقسام، حکمران و شہری کے حقوق و فرائض اور اچھی اجتماعی زندگی کے اصولوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ انسان اجتماعی حیوان ہے؛ جہاں چند افراد اکٹھے رہے وہاں نظم، قیادت اور فیصلے کی ضرورت پیش آئی، اور اسی ضرورت نے سیاسی فکر کو جنم دیا۔ یہ فکر ابتدائی قبائلی رسوم سے شروع ہو کر قدیم تہذیبوں کے قوانین، یونانی فلسفیوں کے باقاعدہ نظریات اور پھر مسلم علماء کی جامع تصانیف تک پہنچی۔ اس جواب میں پہلے علمِ سیاست کی ابتدا کا جائزہ لیا جائے گا، پھر افلاطون اور ارسطو کے بنیادی افکار بیان ہوں گے، اس کے بعد مسلم علماء کی خدمات پیش کی جائیں گی، اور آخر میں تینوں کا تقابلی جائزہ پیش لیا جائے گا۔ کوشش یہ رہے گی کہ ہر مفکر کے افکار اس کی مشہور اور مستند عام فہم صورت میں بیان کیے جائیں، غیر یقینی اقوال کسی کے نام منسوب نہ کیے جائیں۔

علمِ سیاست کی ابتدا

سیاسی فکر کی ابتدا اتنی ہی قدیم ہے جتنی انسانی اجتماعیت۔ قدیم مصر، بابل، ہندوستان اور چین میں بھی حکمرانی کے اصول اور فرائض کی تحریریں ملتی ہیں، مگر باقاعدہ فلسفیانہ بحث کا آغاز عموماً قدیم یونان سے مانا جاتا ہے جہاں پانچویں اور چوتھی صدی قبل مسیح میں شہری ریاستوں (پولس) کے تجربات نے مفکرین کو ریاست کی نوعیت پر غور کرنے پر مجبور کیا۔ یونان میں سوفیوں نے قانون کی نسبت پر سوال اٹھائے، سقراط نے اخلاق اور شہریت کو جوڑا، اور اس کے بعد افلاطون اور ارسطو نے سیاسیات کو باقاعدہ علم کی صورت دی۔ بعد ازاں روم میں انتظامی و قانونی فکر پروان چڑھی، اور اسلامی تہذیب میں قرآن و سنت کی تعلیمات، ریاستِ مدینہ کے تجربے اور خلافت کے نظام نے سیاسی فکر کو نئی وسعت دی۔ مسلم علماء نے یونانی تراث کا تنقیدی جائزہ بھی لیا اور اپنی وحی پر مبنی بنیادوں سے اصل اضافے بھی کیے۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں سیاسیات ایک مستقل سماجی سائنس بن گئی، مگر اس کی بنیادی بحثیں، عدل، اچھا حکمران، شہری کی تربیت اور طاقت کی حدود، آج بھی وہی ہیں جو قدیم مفکرین نے شروع کی تھیں۔

افلاطون کے سیاسی افکار

افلاطون (وفات تقریباً 347 قبل مسیح) سقراط کا شاگرد تھا۔ اس کی مشہور کتاب کا نام عام طور پر (Republic) یعنی ریاست بتایا جاتا ہے، جس میں اس نے مثالی ریاست کا تصور پیش کیا۔ افلاطون کے نزدیک عدل یہ ہے کہ ہر طبقہ اپنا کام کرے: حکمران دانش و حکمت سے، فوجی حفاظت سے، اور کاشت کار و کاریگر پیداوار سے۔ اس نے حکمرانوں کی سخت تعلیم و تربیت پر زور دیا اور مشہور اصول پیش کیا کہ جب تک فلسفی حکمران نہ ہوں یا حکمران فلسفیانہ حکمت نہ سیکھیں، ریاستوں کی برائیاں ختم نہیں ہوں گی۔ افلاطون جمہوری نظام کی افراط و بے ترتیبی پر تنقید کرتا تھا اور اہلیت و تربیت کو ووٹ کی برابری پر ترجیح دیتا تھا۔ اس کے افکار کی خوبیاں عدل پر زور، حکمران کی تربیت اور ریاست کی اخلاقی بنیاد ہیں، جبکہ اعتراضات میں طبقاتی جمود اور آزادی پر پابندیوں کو گنا جاتا ہے۔ اس کی دوسری معروف بحث قوانین (Laws) میں نسبتاً عملی اور قانون پر مبنی نظام کی طرف جھکاؤ نظر آتا ہے۔

ارسطو کے سیاسی افکار

ارسطو (وفات 322 قبل مسیح) افلاطون کا شاگرد تھا۔ اس کی کتاب (Politics) یعنی سیاست کو سیاسیات کی پہلی باقاعدہ سائنسی کتاب سمجھا جاتا ہے۔ ارسطو نے اپنے زمانے کی بہت سی شہری ریاستوں کے دستوروں کا مطالعہ کر کے حکومتوں کی درجہ بندی کی: ایک فرد کی حکومت بادشاہت، چند کی اشرافیہ اور بہت سے شہریوں کی منظم جمہوریت، اور ان کی بگڑی ہوئی صورتوں کے طور پر ظلم، چند خاندانوں کی اجارہ داری اور ہجوم کی حکمرانی کو رکھا۔ اس کا مشہور قول ہے کہ انسان فطرتاً سیاسی حیوان ہے، یعنی وہ معاشرے اور ریاست کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ ارسطو نے متوسط طبقے کو استحکام کی ضمانت قرار دیا، قانون کی حکمرانی پر زور دیا اور شہریت کو فیصلہ سازی میں شرکت سے جوڑا۔ اپنے استاد کے مقابلے میں اس کا انداز مشاہدے اور تجربے پر زیادہ مبنی تھا اور اس نے نجی ملکیت و خاندان کے بارے میں افلاطون کے بعض انتہائی تصورات سے اختلاف کیا۔

مسلم علماء کے سیاسی افکار

مسلم علماء کی سیاسی فکر کی بنیاد وحی ہے، اس لیے ان کے نزدیک سیاست عبادت و اخلاق سے کٹی ہوئی تکنیک نہیں بلکہ خلافت، امانت اور عدل کا نام ہے۔ ابو نصر فارابی نے (آراء اہل المدینۃ الفاضلہ) میں فاضل شہر کا تصور پیش کیا، جس میں سربراہ میں نبوت و حکمت کی صفات کا اجتماع اور معاشرے کے درجات کے باہمی تعاون پر زور ہے۔ ابوالحسن ماوردی نے (الاحکام السلطانیہ) میں خلافت، وزارت، امارت، قضا اور دیگر دینی مناصب کے قواعد کو فقہی انداز میں مرتب کیا، جو انتظامی قانون کی ابتدائی بڑی کاوش ہے۔ امام غزالی نے دین اور حکومت کو لازم و ملزوم قرار دے کر امن و نظم کی اہمیت پر زور دیا۔ ابن تیمیہ نے (السیاسۃ الشرعیہ) میں حکومت کا مقصد عدل، امر بالمعروف اور عوامی مصلحت قرار دیا اور امانت دار و اہل عہدیداروں کے تقرر کو بنیادی اصلاح کہا۔ ابن خلدون نے (المقدمہ) میں عصبیت، ریاستوں کے عروج و زوال کے مراحل اور تمدن کے قوانین پر بحث کر کے عمرانیات اور تاریخی سیاسیات کی بنیاد رکھی، جسے عالمگیر شہرت حاصل ہے۔

جدول 1: افلاطون، ارسطو اور مسلم علماء کے سیاسی افکار کا موازنہ

پہلو	افلاطون	ارسطو	مسلم علماء
فکر کی بنیاد	عقل و فلسفیانہ حکمت	مشاہدہ، تجربہ اور درجہ بندی	وحی (قرآن و سنت) کے ساتھ عقل و تجربہ
مثالی سربراہ	فلسفی حکمران	قانون کے تابع اہل قیادت	دیانت دار، اہل اور شریعت کا پابند خلیفہ / امام
قانون کی حیثیت	حکمت عملی میں قانون ثانوی، بعد میں قانون پر زور	قانون کی حکمرانی بنیادی	شریعت کی بالادستی، حکمران بھی اس کا پابند

انسان خلافت وامانت کا حامل، اجتماعی زندگی ضروری	انسان فطرتاً سیاسی / اجتماعی حیوان	عدل: ہر طبقہ اپنا کام کرے	انسانی فطرت
عدل، دین و دنیا کی فلاح، مصلحتِ عامہ	بھی زندگی اور شہری فلاح	عدل اور شہریوں کی اخلاقی تربیت	ریاست کا مقصد

تقابلی جائزہ

تقابل سے چند نمایاں نکات سامنے آتے ہیں۔ پہلا اشتراک یہ ہے کہ تینوں روایات ریاست کو انسانی بھلائی کا ذریعہ مانتی ہیں اور اچھی قیادت کی تربیت پر زور دیتی ہیں۔ دوسرا نکتہ اختلافِ بنیاد ہے: یونانی فکر عقل اور مشاہدے سے چلتی ہے جبکہ مسلم فکر وحی کو اصل ماخذ مان کر عقل کو اس کی روشنی میں استعمال کرتی ہے، اسی لیے اس میں حکمران کی جواب دہی صرف عوام تک نہیں اللہ تعالیٰ تک پھیلی ہوئی ہے۔ تیسرا نکتہ قانون کی پوزیشن ہے: ارسطو نے قانون کی حکمرانی پر جو زور دیا، مسلم علماء نے اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر ایسا قانون پیش کیا جو حکمران کی مرضی سے نہیں بنتا بلکہ اس پر بھی حاوی ہے۔ چوتھا نکتہ طبقاتی تصور ہے: افلاطون کا طبقاتی نظام نسبتاً جامد ہے، ارسطو نے متوسط طبقے کے توازن کی بات کی، جبکہ اسلامی فکر نے قانونی مساوات اور تقویٰ کو فضیلت کا معیار قرار دے کر نسبی و طبقاتی امتیاز کی نفی کی۔ پانچواں نکتہ موضوعات کی وسعت ہے: مسلم علماء نے انتظامی قانون، مالیاتی نظام، عدلیہ اور بین الاقوامی تعلقات جیسے عملی شعبوں پر بھی باقاعدہ لکھا، جس سے ان کی فکر محض نظریے سے بڑھ کر نظام کی صورت اختیار کر گئی۔ ابن خلدون کی عمرانیات کو مغربی مفکرین نے بھی سماجی سائنس کی بنیادوں میں شمار کیا ہے، جو مسلمانوں کی اصل شراکت کو ظاہر کرتی ہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ علمِ سیاست کی ابتدا قدیم اجتماعیت سے ہوئی، یونان میں افلاطون اور ارسطو نے اسے فلسفیانہ و سائنسی بنیاد دی، اور مسلم علماء نے وحی، عدل اور انتظامی تجربے کی روشنی میں اسے ایک جامع نظام میں ڈھالا۔ افلاطون نے مثالی ریاست اور فلسفی حکمران کا تصور دیا، ارسطو نے درجہ بندی، قانون کی حکمرانی اور متوسط طبقے کی اہمیت اجاگر کی،

جبکہ فارابی، ماوردی، غزالی، ابن تیمیہ اور ابن خلدون نے خلافت، مناصب کے قواعد، عدل اور تمدنی قوانین پر اصیل اضافے کیے۔ تقابلی مطالعہ طالب علم کو یہ سمجھ دیتا ہے کہ سیاسی فکر ایک مسلسل انسانی مکالمہ ہے جس میں ہر تہذیب نے اپنے حصے کا نکتہ شامل کیا ہے۔

سوال نمبر 5: اسلامی ریاست کے بین الاقوامی تعلقات کے اصول، مسلم و غیر مسلم ریاستوں سے تعلقات اور معاہدات

سوال نمبر 5۔ اسلامی ریاست کے بین الاقوامی تعلقات کے اصول بیان کریں، خصوصاً مسلم ممالک اور غیر مسلم ریاستوں سے تعلقات اور معاہدات کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کی وضاحت کریں۔ (20)

تعارف

کوئی ریاست تنہائی میں زندگی نہیں گزار سکتی؛ تجارت، سفارت، ثقافتی تبادلہ اور امن و جنگ جیسے معاملات اسے دوسری ریاستوں سے جوڑتے ہیں۔ اسلام نے بین الاقوامی تعلقات کے لیے بھی اصول دیے ہیں، جو اخلاق، عدل اور وفائے عہد پر مبنی ہیں۔ اسلامی تعلیمات میں انسانی برادری کا تصور بنیادی ہے؛ قرآن انسانوں کو ایک ہی اصل سے تعبیر کرتا ہے اور قبائل و اقوام کے تعارف کو باہمی پہچان کا ذریعہ قرار دیتا ہے، تصادم کا نہیں۔ اس جواب میں پہلے بین الاقوامی تعلقات کے عمومی اصول بیان ہوں گے، پھر مسلم ممالک سے تعلقات، غیر مسلم ریاستوں سے تعلقات اور آخر میں معاہدات کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کی وضاحت کی جائے گی۔ یہ بحث تعلیمی ہے؛ عصر حاضر میں کسی ریاست کے عملی فیصلے ملک کے آئین، حکومت اور ماہرین کے دائرے میں ہوتے ہیں، جن کی شرعی تشخیص اہلِ علم کا کام ہے۔

بین الاقوامی تعلقات کے بنیادی اصول

پہلا اصول امن پسندی ہے۔ اسلام کی اصل حالت امن ہے؛ جنگ استثنائی صورت ہے جو دفاع یا بڑے ظلم کی روک کے لیے ہوتی ہے، اور جہاں صلح ممکن ہو اسے ترجیح دی جاتی ہے۔ دوسرا اصول عدل ہے، حتیٰ کہ دشمن کے ساتھ بھی ناانصافی کی اجازت نہیں؛ قرآن کی عمومی تعلیم ہے کہ کسی قوم کی دشمنی انسان کو عدل سے نہ ہٹائے۔ تیسرا اصول

وفائے عہد ہے؛ معاہدہ چاہے کمزور فریق سے ہو یا طاقتور سے، اس کی پابندی لازم ہے، اور معاہدہ توڑنا ہو تو بھی دھوکے سے نہیں بلکہ واضح اعلان سے ہو۔ چوتھا اصول عدم جارحیت اور دوسروں کے معاملات میں بلاجواز مداخلت سے اجتناب ہے۔ پانچواں اصول سفارتی آداب کا احترام ہے؛ سفیروں کی حفاظت اور پیغام رسانی کا تحفظ سیرت سے ثابت ہے۔ چھٹا اصول انسانی ہمدردی اور بھلائی کا تعاون ہے؛ نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں تعاون کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ اصول مل کر اسلامی خارجہ تعلقات کا اخلاقی ڈھانچہ بناتے ہیں۔

مسلم ممالک کے ساتھ تعلقات

مسلم ریاستوں کے باہمی تعلقات کی بنیاد اخوت ہے۔ قرآن اہلِ ایمان کو بھائی قرار دیتا ہے اور ان کے درمیان صلح کرانے کا حکم دیتا ہے، اور نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو ایک جسم کی مثال سے سمجھایا کہ ایک حصے کی تکلیف سارا جسم محسوس کرتا ہے۔ اس اصول کے عملی تقاضے یہ ہیں کہ مسلم ریاستیں باہمی تنازعات مذاکرات اور ثالثی سے حل کریں، ضرورت کے وقت ایک دوسرے کی مدد کریں، تجارت و علم میں تعاون بڑھائیں، اور کمزور مسلم آبادیوں کی قانونی و اخلاقی حمایت کریں۔ تاریخی طور پر مختلف مسلم ریاستیں باہم معاہدے، تجارتی تعلقات اور علمی روابط رکھتی رہی ہیں۔ اختلافات کے باوجود ادب، عدم تکفیر اور مصالحت کی راہ اختیار کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ عصری دور میں مسلم ریاستوں کے مشترکہ ادارے اور کانفرنسیں اسی اخوت کو ادارہ جاتی شکل دینے کی کوششوں میں شمار ہوتی ہیں، جن کی کامیابی کا انحصار انہی اصولوں کی پابندی پر ہے۔

غیر مسلم ریاستوں کے ساتھ تعلقات

غیر مسلم ریاستوں کے ساتھ تعلقات کے بارے میں اسلامی تعلیمات کی بنیاد بھی عدل اور بھلائی ہے۔ قرآن کی عمومی ہدایت یہ ہے کہ جو لوگ دین کے معاملے میں جنگ نہ کریں اور مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نہ نکالیں، ان کے ساتھ بھلائی اور انصاف سے پیش آنا ممنوع نہیں بلکہ پسندیدہ ہے۔ سیرت میں اس کی روشن مثالیں موجود ہیں: میثاقِ مدینہ میں غیر مسلم قبائل کو شہری حقوق اور مذہبی آزادی دی گئی؛ نجران کے عیسائی وفد کو مسجدِ نبوی میں ٹھہرایا گیا اور ان کے ساتھ معاہدہ ہوا؛ اور مختلف قبائل و ریاستوں کے ساتھ ان کے مذہب کو چھیڑے بغیر سیاسی و تجارتی معاہدے ہوئے۔ غیر مسلم شہریوں کے جان، مال اور عبادت گاہوں کے تحفظ کو سیرت و فقہ کی کتب میں ریاست کی ذمہ

داری قرار دیا گیا ہے۔ ساتھ یہ بھی واضح رہے کہ تعلقات کا اصل پیمانہ ریاستوں کا رویہ ہے، محض مذہبی شناخت نہیں؛ امن پسند فریق سے پرامن تعاون اور جارح فریق کے مقابلے میں دفاع، یہی متوازن پالیسی اسلامی تعلیمات سے نکلتی ہے۔

معاہدات کے حوالے سے اسلامی تعلیمات

معاہدات اسلامی بین الاقوامی تعلقات کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ قرآن نے عہد کی پابندی کو ایمان کا تقاضا قرار دیا ہے اور بدعہدی کو سخت ناپسند کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے صلح حدیبیہ سب سے نمایاں عملی مثال ہے؛ بظاہر سخت شرائط کے باوجود نبی کریم ﷺ نے جنگ کے بجائے معاہدے کو قبول کیا اور اس کی ہر شرط کی پاسداری فرمائی، حتیٰ کہ اپنے حلیفوں کے معاملے میں بھی عہد کو ترجیح دی، اور نتیجتاً اس صلح کو فتحِ مبین قرار دیا گیا۔ اسی طرح معاہدے کی خلاف ورزی کرنے والے فریق کے ساتھ بھی پہلے واضح صورت اختیار کی جاتی اور دھوکے سے حملہ کرنے کی ممانعت رہتی ہے۔ اسلامی فقہ میں امان کا تصور بھی اہم ہے؛ جس فرد یا وفد کو امان دی جائے اس کی جان و مال محفوظ ہو جاتے ہیں۔ جدید بین الاقوامی قانون میں معاہدوں کی پاسداری (پیکٹا سنٹ سروانڈا) کا اصول اسی اخلاقی بنیاد سے ملتا ہے۔ طالب علم کے لیے نکتہ یہ ہے کہ اسلام معاہدے کو وقتی چال نہیں، عہدِ الٰہی کی نگرانی میں کیا گیا پابند وعدہ سمجھتا ہے۔

جدول 1: بین الاقوامی تعلقات میں فریق کے اعتبار سے اسلامی رہنمائی

عملی صورت	بنیادی اصول	فریق
مذاکرات، باہمی مدد، مشترکہ ادارے، تنازعات کا پرامن حل	اخوت، تعاون، مصالحت	مسلم ریاستیں
تجارت، سفارت، ثقافتی و علمی تبادلہ، معاہدات	عدل، بھلائی، وفائے عہد	پرامن غیر مسلم ریاستیں
شرائط کا احترام، خلاف ورزی پر بھی اعلان کے بغیر	عہد کی مکمل پابندی	معاہدہ کرنے والے فریق

اقدام نہیں		
متناسب دفاع، شہری آبادی کا تحفظ، صلح کی پیشکش	دفاع، حد سے عدم تجاوز	جارح فریق

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست کے بین الاقوامی تعلقات امن، عدل، وفائے عہد، حرمت، انسانیت اور انسانی ہمدردی کے اصولوں پر قائم ہیں۔ مسلم ممالک سے تعلقات اخوت اور تعاون پر، غیر مسلم پر امن ریاستوں سے تعلقات بھلائی اور انصاف پر، اور معاہدات میں پاسداری اور امان کے تحفظ پر مبنی ہیں۔ صلح حدیبیہ اور میثاقِ مدینہ ان اصولوں کی تاریخی عملی شکلیں ہیں۔ یہ تعلیمات آج کے عالمی نظام کے لیے یہ پیغام رکھتی ہیں کہ طاقت کے ساتھ اخلاقی پابندی ہی پائیدار امن کی ضمانت ہے، اور یہی اسلامی ریاست کے خارجہ تصور کی روح ہے۔